پروفیسر حافظ احمد یار

اسلام کا روحانی نظام

محترم صاحب صدر اور معزز سامعین!

اصل موضوع پر بات کرنے سے پہلے تین وضاحتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں :-

(۱) سب سے پہلے یہ کہ مقالہ نگار کوئی "روحانی عامل" نہیں اور نہ ہی موضوعِ گفتگو عملیات۔ تعویذ گنڈے یا "طلسمات" ہیں۔ یہ نظام بھی ہمارے ہاں رائج ہے اور صحیح معنوں میں ایک "عوامی نظام" ہے اور شکم پروری کے سامانوں میں سے ایک سامان ہے۔ اس "روحانی دنیا" میں جہالت اور توہم پرستی (SUPERSTITIONS) کے عناصر اتنے زیادہ ہیں کہ اس قسم کے "اعمال" کی شرعی اصل اگر کوئی تھی بھی تو ــــ وہ تو ــــ پس منظر میں چلی گئی ہے ــــ اور ہمارا یہ نام نہاد "روحانی نظام" اب تو عرب جاہلیت کے کاہنوں اور یہود کے جادوگروں کی یاد دلاتا ہے۔

(۲) دوسری وضاحت یہ ضروری ہے کہ روحانی نظام سے ہماری مراد انسان کی بعض باطنی استعدادات کی وہ تربیت بھی نہیں جسے ہپناٹزم و مسمریزم۔ یوگا اور ٹمو وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں انسان کے اندر ایک غیر مادّی قوت یا قوتوں کے وجود کا پتہ تو دیتی ہیں یعنی انسان کی مادّی یا جسمانی قوتوں سے ماوراء۔ اس کے اندر۔ کچھ ایسی غیر مادّی یا روحانی یا باطنی قوت بھی موجود ہے جس کی تربیت کی جا سکتی ہے۔

اور اسی کے ساتھ وابستہ ہے کشف و کرامات یا ان سے ملتا جلتا وہ نظام جس کے وجود کا پتہ ہر مذہب و ملت میں ملتا ہے اور جسے قطعی معیارِ حق ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگرچہ اس میں بھی دھوکے اور فراڈ کو حقیقت سے متمیز کرنا کارِ دشوار ہے تاہم موضوع دونوں صورتوں میں روحِ انسانی یا انسان کی روحانی قوت ہے۔

اسلامی روحانی نظام کی اصل غرض وغایت "روح کا تزکیہ" ہی ہے۔ انسان کی روحانی یا غیر مادی قوتوں کی پرورش وتربیت اور اس کی نمائش (DEMONSTRATION) اور اس کے مقابلے پر "اسلامی تزکیۂ روح" کی مثال ایک بزرگ نے یوں دی تھی کہ آپ کسی دھات وغیرہ کی بنی ہوئی چیز کو پیشاب سے دھوکر بھی، اس کا میل اور زنگ دور کرکے اس میں ایک صیقل اور جلاء (چمک) پیدا کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ صیقل وجلاء طہارت سے محروم رہے گا جب کہ اسلام میں روح کی اس صیقلگری کی بنیاد ہی۔ ظاہری وباطنی "طہارت" پر ہے۔

(۳) اس سلسلے میں تیسری وضاحت یہ ہے کہ اس مقالہ کا موضوع کوئی "درسِ تصوّف" بھی نہیں ہے اور یہ اوّلاً تو اس لئے کہ مقالہ نگار کوئی عارمحسوس کئے بغیر یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اس "فن" کا مبتدی بھی نہیں۔ ثانیاً یہ بھی کہ تصوّف اپنے درست معنوں میں بھی تعلیم یا محض تقریر نہیں بلکہ ایک "تربیت" کا نام ہے۔ اور اس کا مقام "پبلک سٹیج" نہیں ہے۔ اور ثالثاً یہ بھی کہ اس معاملے میں پاکستانی مصنوعات کی طرح اصلی اور نقلی کی پہچان کا رِدشوار ہے۔ امام غزالیؒ کو یہ شکایت تھی کہ تصوّف میں مدّعی زیادہ اور کاملین یا مخلصین کم ہیں۔ اور اب تو اس وقت کی نسبت بھی "خیر القرون" سے قریباً ایک ہزار سال اور بھی پیچھے جا پڑے ہیں۔ اور اب تو تصوّف کے وارثوں کی حالت بھی مسلم لیگ کے وارثوں کی سی ہے۔ جن کے پاس سب سے وزنی اور جاندار نعرہ "پدرم سلطان بود" رہ گیا ہے۔

"روحانی نظام" میں روح کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں تو ہم "اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ روح اس جسدِ خاکی کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ اور یہ بات تو اجتماعی عقلِ انسانی نے تسلیم کر لی ہے کہ جسم کی اپنی دنیا ہے اور روح کی اپنی دنیا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی ضروریات اور خواہشات ہیں۔ خود بھوکا ہوتے ہوئے اپنی روٹی کسی غریب کو دے دینے میں دکھ کی بجائے لذّت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ یہ لذّت جسمانی ہے یا روحانی؟ اسی طرح جیب میں مال رکھتے ہوئے کسی معذور اور مجبور کی مدد نہ کرنا ـــــ حالانکہ اس کی مجبوری اور معذوری کو وجود میں لانے میں ہمارا کوئی قصور نہ ہو ـــــ ایسے آدمی کی ـــــ استطاعت

کے باوجود ـــــ مدد نہ کرنا آخر (انسانی معاشرے میں) مذموم کیوں سمجھا جاتا ہے؟

الغرض جسم کی طرح روح کی بھی ضروریات، خواہشات اور استعدادات ہیں۔ اس کا ایک واضح اور بیّن ثبوت یہ بھی ہے کہ اگر انسان کی ساری جسمانی ضروریات پوری کر دی جائیں۔ بلکہ تمام جسمانی آسائشیں بھی مہیّا کر دی جائیں تو ضروری نہیں کہ وہ اندرونی ـــــ روحانی اور قلبی ـــــ امن و سکون سے بھی بہرہ ور ہو جائے۔ ہمارے دور سے زیادہ جسمانی اور مادی آسائشیں بلکہ تعیّشات غالباً تاریخ کے کسی دور میں انسان کو حاصل نہیں ہوئیں۔ لیکن بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج نیند جیسا فطری عمل بھی گولیوں اور دواؤں کا مرہونِ منّت بن کر رہ گیا ہے۔

بعض قوموں یا ملّتوں کا خیال ہے کہ جسم اور روح کے مقتضیات اور مفادات میں ایک تضاد اور تعارض ہے اور ایک کی ترقی دوسرے کی تنزّلی یا تباہی کے بغیر ممکن نہیں ـــــ اسی نظریہ سے ـــــ ایک طرف تو نری مادی لذّت پرستی ـــــ اور دوسری طرف ترکِ لذّات بلکہ ترکِ ضروریات ـــــ جیسے متضاد اور انتہا پسندانہ نظریات وجود میں آئے۔

دینِ اسلام نے جسم اور روح کے تقاضوں کو افراط اور تفریط سے ہٹا کر ایک حکیمانہ توازن اور اعتدال کی راہ دکھائی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے جسمانی افعال و اقوال ہماری روح کو متأثر بھی کرتے ہیں اور اس سے متأثر بھی ہوتے ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ہمارے ظاہری افعال و اعمال ہماری باطنی یا روحانی کیفیت کے اسباب بھی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ اس کی علامات بھی ہوتے ہیں۔ جسم اور روح کے اس تعلق اور ان کی فعّالیت اور انفعالیت کی بنا پر دینِ اسلام نے جسم اور روح دونوں کی اصلاح اور فلاح کے لئے احکام دیئے ہیں۔ جن احکام کا تعلق ظاہری جسمانی اعمال کی درستی سے ہے اسے ہم فقہ یا "فقہ الشریعۃ" کہہ سکتے ہیں۔ اور جن امور کا تعلق اعمال کے باطنی اور روحانی پہلو سے ہے۔ اسے بقول سید ابوالحسن علی ندوی ہم "فقہ الباطن" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

جس طرح جسم کی ظاہری صحت اور راحت منجملہ دیگر امور کے دراصل تو منحصر ہے اس کے اندرونی اعضاء اور خصوصاً اعضائے رئیسہ مثلاً دل، دماغ اور جگر وغیرہ کی درست کارکردگی پر ـــــ اسی طرح انسان کی روحانی یا باطنی صحت اور قوت کا سرچشمہ ہیں انسان کی تین لطیف

باطنی استعدادات جسے اکثر صوفیہ "لطائفِ ثلاثہ" سے تعبیر کرتے ہیں یعنی (۱) لطیفۂ عقل، (۲) لطیفۂ قلب اور (۳) لطیفۂ نفس۔

ان میں سے "عقل" ان علوم کا منبع اور مخزن ہے جن کو انسان حواس کے ذریعے حاصل کرتا ہے یعنی تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہونے والا علم ـــــ بلکہ عقل ہی کے ذریعے ان حقائق و معارف کا ادراک ہوتا ہے جن کے ادراک سے، بعض دفعہ، حواس قاصر رہتے ہیں۔ عقل کی صفات اور اس کے افعال ہی میں شامل ہے یقین، شک، توہم، ہر ایک واقعہ کا سبب تلاش کرنا اور حصولِ منافع یا دفعِ مضار کی تدبیریں سوچنا وغیرہ۔ لطیفۂ عقل حواس کی مدد کا محتاج ہے۔ اور اگر حواس عقل کے ادراک کے لئے مواد بہم نہ پہنچائیں تو عقل کے معطل اور بے کار ہونے میں کچھ شک نہیں۔

دوسرا لطیفہ قلب (دل) ہے۔ جو حُب اور بغض کا منبع ہے اور ارادہ و اختیار اس سے صادر ہوتے ہیں۔ نیز اس قلب کے ہی افعال اور صفات ہیں غضب اور جرأت، بزدلی یا بہادری، بخل اور سخاوت، خوف و رجاء اور حُب و بغض کے متعلق تلوّن کا مظاہرہ۔ بالفاظ دیگر تمام خیر و شر کا اصل منبع اور مخزن یہی "قلب" ہے۔ اس پر مزید بات ابھی آگے آئے گی۔

تیسرا لطیفہ نفس ہے۔ یہ اس (استعداد) کا نام ہے جس میں مستلذات یعنی کھانے پینے کی لذیذ اشیاء کی طلب اور جنسی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ نفس ان چیزوں کا حریص رہتا ہے ـــ اور ویسے اس حرص کا ایک فائدہ بھی ہے کیونکہ بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ، نفس ہی ان امور کا تقاضا کرتا ہے جن کے بغیر "ہیکل انسانی" یعنی فرد یا معاشرہ کا قائم رہنا محال اور ناممکن ہے۔ کھانے پینے، سونے اور جنسی تعلق کے یہ تقاضے ہی انسان کی حیوانی زندگی کا دائرہ ہے۔ تاہم حیوانی زندگی کے تقاضوں اور ضروریات تک محدود رہ جانا یا صرف اسی زندگی کی آسائشوں کو ہی نصب العین بنا لینا ـــــ مذموم کام ہے۔

یہ ہر سہ لطائف یعنی عقل، قلب اور نفس ایک دوسرے کی مدد اور اعانت کے محتاج ہیں۔ مثلاً ادراک عقل کا کام ہے اور غضب یا بغض و محبت کا منبع قلب ہے ـــ اگر

کوئی آدمی تلخ یا شیریں کلام یا وعظ و انذار کا ادراک ہی نہ کر سکے تو اس کے جذباتِ حب و بغض اور خوف و رجاء میں کوئی ہیجان پیدا نہ ہوگا ـــــ اسی طرح اگر قلب کی اعانت شامل نہ ہو اور وہ اعضاء کو اپنے حسبِ ارادہ تصرّف میں نہ لائے تو انسان کا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تگ و دو کرنا ممکن نہیں ہے ۔ یا یوں کہئے کہ جو بات دل میں نہ جمے یا جس بات پر دل نہ جمے مثلاً عقیدہ ـــــ تو اعمال میں اس کا اثر قطعاً ظاہر نہیں ہوگا ۔

پھر یہ بات بھی تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ان لطائفِ ثلاثہ کے تقاضے مختلف افراد میں جبلّتہً یا عادتہً مختلف ہوتے ہیں ۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے قلب (کے ارادہ) کو ان کے نفس (کی خواہشات) پر پورا تسلّط حاصل ہوتا ہے ۔ ایسے آدمی کو جب کسی اعلیٰ مقصد کی طلب پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کے لئے بڑی سے بڑی نفسانی لذّت کو بھی بلا تامّل ترک کر دیتا ہے ـــــ یا مثلاً وہ بھوکا اور چیتھڑوں میں ہوتے ہوئے بھی ـــــ اپنی عزتِ نفس کی خاطر ـــــ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتا ـــــ اس کے برعکس بعض لوگوں پر نفس (کی خواہشات) کو کامل اقتدار حاصل ہوتا ہے اور ان کا قلب (یا ضمیر) ہمیشہ مغلوب رہتا ہے ۔ ایسا آدمی اپنی کسی نفسانی خواہش کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا ۔ چاہے اس کے لئے کتنا ہی ننگ اور عار اس کو لاحق ہو ـــــ بعض افراد کی عقل ان کے قلب اور نفس پر غالب ہوتی ہے ۔ ایسا آدمی ہر وقت اور ہر حال میں شریعت (اور قانون) کا مطیع رہتا ہے ۔ اور اس کے احکام سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا ـــــ اسی طرح ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ انسانوں کے اندر ان تین استعدادات یا لطائف میں سے کسی وقت کسی ایک (لطیفہ) کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی کسی دوسرے کا ۔

عقل، قلب اور نفس کے بارے میں یہ (مندرجہ بالا) وہ امور ہیں جن کے اثبات (یعنی موجود ہونے) پر قریب قریب ہر مذہب و ملّت میں اتّفاق ہے ۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ ـــــ "ہر مذہب و ملّت کے حکماء اور عقلاء جنہوں نے تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کی بات کی ہے سب نے ان لطائفِ ثلاثہ کا اثبات کیا ہے ـــــ یا کم از کم انہوں نے جن مقامات

اور احوال کی تشریح کی ہے وہ ان ہی لطائفِ ثلاثہ کے نتائج اور ثمرات ہیں" (حجۃ اللہ البالغہ)

صوفیہ کرام نے بھی ان لطائف ثلاثہ کا اثبات کیا ہے اور ان کی تہذیب پر اپنی توجہ مبذول کی ہے اور اس کے لئے بعض دفعہ انہوں نے اپنی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ مثلاً جب کسی کے لطیفۂ عقل میں ایسی نورانیت پیدا ہو جائے جس کی بدولت وہ ان باتوں کی تصدیق پر مائل ہوتا ہے جن کی تصدیق کرنا ـــــ یعنی جن پر ایمان لانا انسان پر فرض ہے ـــــ یعنی جب عقل صفائی اور پاکیزگی کے اس منتہائے کمال تک پہنچ جائے تو وہ (صوفیہ) اس کو عقل کی بجائے "سِرّ" کہتے ہیں۔ اور جب قلب (دل) کی طہارت اور پاکیزگی منتہائے کمال کو پہنچ جائے تو وہ اسے قلب نہیں بلکہ "روح" کہتے ہیں ـــــ اسی طرح جب نفس میں حیوانی تقاضے غالب ہوتے ہیں تو وہ اسے ـــــ قرآنی اصطلاح کے مطابق ـــــ نفسِ امّارہ کہتے ہیں۔

اور جب انسان بہیمیت اور ملکیت کے خصال اختیار کرنے میں ڈانواں ڈول ہوتا ہے کہ کبھی نیکی کی طرف جھک جائے اور کبھی بدی کا پلڑا بھاری ہو جائے تو اسے وہ نفسِ لوّامہ کہتے ہیں ـــــ یہ بھی قرآنی اصطلاح ہے ـــــ برخلاف اس کے جب انسان کا نفس ہر طرح سے شرع کا پابند ہو اور وہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کا کامل طور پر مطیع و منقاد ہو جائے اور کسی ایسی چیز کی طرف اس میں حرکت پیدا نہ ہو جو اللہ تعالےٰ کی مرضی کے خلاف ہو ـــــ تو اس حالت میں وہ نفسِ مطمئنّہ کہلانے کا مستحق ہے ـــــ اور یہ بھی قرآنی اصطلاح ہے۔ گویا اہلِ تصوّف کے ہاں مطلوب و مقصود "سِرّ" (یعنی کامل اور مہذّب عقل)، "روح" (یعنی کامل اور مہذّب قلب) اور "نفسِ مطمئنّہ" (یعنی کامل اور مہذّب نفس) ہیں۔

ان تین لطائف یا استعدادات کی تہذیب یا تطہیر و تزکیہ قرآن کریم کا ایک اہم موضوع ہے۔ قرآن کریم سب سے پہلے عقلِ انسانی کی تہذیب چاہتا ہے۔ یعنی ان لطائفِ ثلاثہ کی تہذیب و اصلاح کا کام ایمان باللہ سے شروع ہوتا ہے۔ جب عقلِ انسانی ایسے سچّے عقائد کے تابع ہو جو سرچشمۂ نبوّت سے ماخوذ ہوں ـــــ یعنی جب آدمی اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور

اس کی کتاب کی تصدیق کرتا ہے تو آہستہ آہستہ یہ ایمان اس کے قلب میں اترتا ہے اور پھر اس کا قلب اور نفس بھی اس ایمان کے تابع ہو جاتے ہیں اور لطائفِ ثلاثہ میں سے ہر ایک پر اس کی استعداد کے مطابق عبودیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔

لطائفِ ثلاثہ کی تہذیب و اصلاح کا عمل عقل سے شروع ہونے پر دلالت کرتی ہیں وہ تمام ـــــ تیس سے زائد ـــــ آیاتِ قرآنی جو عموماً " لَآیَاتٍ " یا " لَآیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ " ـــــ یا " اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ " یا " لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ " کے الفاظ پر ختم ہوتی ہیں یا قرآن کی سولہ کے قریب وہ آیات جن میں یا تو " اُولُوا الْاَلْبَابِ " (عقلوں والوں) کو مخاطب کیا گیا ہے یا ان کی بعض صفات بیان ہوئی ہیں ـــــ اور اس قسم کی تمام آیات میں بالعموم دعوت الی الحق کے دلائل ہیں اور جن کا نتیجہ ایمان باللہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

★ عقل کا عام اقتضاء اسباب کی تلاش کر کے نتیجہ تک پہنچنا ہے ـــــ مگر عام حالات میں انسان کی عقل بشری تقاضوں سے گھری رہتی ہے اور وہ صرف ان امور کی تصدیق پر مائل ہوتی ہے جو اس کی طبیعت کے موافق ہوں۔ لیکن جب عقل کی تہذیب کر لی جائے تو پھر وہ ان تمام امور پر جن کی بابت شارع نے خبر دی ہے اس طرح یقین کرتی ہے گویا آدمی ان کو عیاناً دیکھ رہا ہے۔ اس وقت اس پر " عَلٰی بَصِیْرَۃٍ " ہونے کا اطلاق ہوتا ہے ـــ اور اسی چیز کو بعض صحابہؓ کی طرف منسوب اس قول میں بیان کیا گیا ہے کہ " اگر جنّت اور جہنّم یعنی بہشت اور دوزخ عیاں ہو کر ہمارے سامنے آجائیں تو ہمارے ایمان میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم تو " بالغیب " ہی ان امور پر " حق الیقین " بلکہ " عین الیقین " کی طرح ایمان لا چکے ہیں ـــــ عقل کی اصلاح اور تہذیب و تطہیر ہو جائے تو قلب اور نفس کا مہذّب ہو جانا ناگزیر ہے۔

★★ اسی طرح قلب کا عام اقتضاء یہ ہے کہ آدمی کو اپنے محسن و مربّی کے ساتھ محبّت ہو۔ یا وہ نفع بخش چیزوں کا جویا اور خواہاں ہو اور جو چیز نقصان دیتی ہو اس سے خائف اور ہراساں رہے جب قلب کی تہذیب کر لی جائے تو اللہ کی محبت اور ہیبت اور اس کے عذاب و ثواب سے خائف یا امیدوار رہنا اس میں رچ بس جاتا ہے۔

چونکہ قلب کا درجہ عقل اور نفس کے درمیان ہے اس لئے قرآن کریم میں انسان کی اکثر صفات کو اور اس کے اکثر افعال کو قلب کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ عقل کے افعال کو قلب کی طرف نسبت دی گئی ہے مثلاً " لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا " (الاعراف : ۱۷۹) اور " ..... فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا " (الحج : ۴۶) اور کہیں نفس اور قلب ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً " وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ " (الاحزاب : ۵۱) اور " رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ " (الاسراء : ۲۵) گویا ایک طرح سے قلب کے بیان میں عقل اور نفس کا بیان بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ قلب کے احوال و عوارض اور اس کی اصلاح و تہذیب اور اس کے تزکیہ و تطہیر پر قرآن کریم نے بہت زور دیا ہے۔

ایمان بھی کامل تب ہوتا ہے جب اقرار باللسان اور تصدیق عقلی سے بڑھ کر یقین قلبی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن کریم نے ایمان کے دل میں داخل ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ (الحجرات : ۱۴ میں)

قرآن حکیم کی مختلف آیات میں قلب (دل) کے روحانی عوارض کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً دل کا اندھا ہونا ـــ فَتَعْمَى الْقُلُوبُ (الحج : ۴۶) ـــ دل میں حق سے نفرت ہونا یا اشمئزاز قلب (الزمر : ۴۵ میں) دل کی کجی یا زیغ قلب (آل عمران :، اور کئی دیگر مقامات پر) ـ دل کا غفلت میں مبتلا ہونا (الکھف : ۲۸) دل کا سخت ہونا یا قساوۃ قلب (مثلاً الزمر : ۲۲ ، الحدید : ۱۶ اور دیگر مقامات پر) دل کی نادرستی یا روگ یعنی مرض قلب (جس کا ذکر البقرہ : ۱۰ کے علاوہ بارہ دیگر مقامات پر ہوا ہے) ، دل پر مہر لگ جانا یعنی ختم یا طبع علی القلب (مثلاً الجاثیہ : ۲۲ ، البقرہ : ۷ ، التوبۃ : ۹۳ اور دیگر مقامات پر) دل پر میل یا زنگ آنا یعنی رین قلب (المطففین : ۱۴) ، دل پر قفل پڑنا (محمد : ۲۴) ، دل میں غیر اسلامی غیرتوں کا جگہ پکڑنا یعنی " حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ " (الفتح : ۲۶) وغیرہ وغیرہ۔

ان جملہ عوارض سے آگاہ ہونا اور ان کو دور کر کے لطیفۂ قلب کی سلامتی اور اصلاح کی کوشش کرنا اسلام کے روحانی نظام کا ایک اہم پہلو ہے۔

ان عوارض سیئہ کے مقابلے پر اسلام کا مطلوب و مقصود "قلبِ سلیم" ہے (الشعراء:۸۹) یعنی ان سب عوارض سے پاک اور صحیح و تندرست قلب۔ ایسے ہی دل کو قرآن حکیم میں (اللہ کی طرف) جھکنے والا دل یعنی "قلبِ مُنیب" (ق: ۳۳ اور دیگر جگہوں پر) کہا گیا ہے۔ تقویٰ کو (جو ہدایتِ قرآنی کا مطلوب و مقصود ہے) دل کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے یعنی "تقویٰ القلوب" (الحج: ۳۲ اور الحجرات: ۳ میں)۔ قلب (دل) کی اصلاح اور تطہیر کے عوامل یا نتائج کے بارے میں قرآن مجید نے حسب ذیل امور کا خصوصاً ذکر کیا ہے: دل میں ہیبتِ الٰہی کا پیدا ہونا "وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ" (الانفال: ۲) اور "قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ" (المؤمنون: ۶۰)۔ دل میں عاجزی اور نرمی پیدا ہونا جسے اِخبات، خشوع اور لِین سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً (ھود: ۲۳ اور الحج: ۳۴ و ۵۳ پر) اور (الاحزاب: ۵ اور الاسراء: ۱۰۹ پر) اور (الزمر: ۲۳ پر) ــــ اسی طرح دل کا درست راستے پر پڑنا یا ہدایت پانا (التغابن: ۱۱ میں) اور دل کا اطمینان و سکون کی دولت سے مالا مال ہونا (الرعد: ۲۸) وغیرہ وغیرہ۔

مجموعی طور پر قرآن کریم کی سو سے زائد آیات کا موضوع قلبِ انسان ہے۔ اس لئے اسلام کے روحانی نظام میں سب سے زیادہ زور اسی "قلب" کی اصلاح پر دیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اسی "مضغۂ قلب" کی صلاح اور فساد کے ساتھ پورے روحانی فساد و اصلاح کو وابستہ کیا گیا ہے۔

خیال رہے کہ قلب یا دل انسانی جسم کے اندر صنوبری شکل کا ایک (مشہور) عضو ہے۔ جو بدن میں جریانِ و دورانِ خون کا ذمہ دار ہے۔ قرآن کریم میں علم الفعال الاعضاء کی رو سے اس قلب کے "وظائف" کا بیان نہیں ہوا۔ بلکہ منبعِ خیر و شر ہونے کی حیثیت سے اس کی کیفیات کا ذکر ہے۔ جس طرح انسان کی جسمانی موت و حیات کا انحصار قلب (دل) پر ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے انسان کی روحانی موت و حیات کا مرکز اسی قلب کو ٹھہرایا ہے

حدیث شریف میں اسے مضغہ (لوتھڑا) اور قرآن مجید میں "اَلْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ" (دل جو سینوں کے اندر ہیں) کہہ کر بظاہر اسی قلب نامی جسمانی عضو کا ذکر کیا گیا ہے تاہم بات اس کے جسمانی اور عضوی نہیں بلکہ روحانی افعال واحوال کی ہوئی ہے جو اس وقت زیرِ مطالعہ موضوعِ بحث ہیں۔

★★★ تیسرے لطیفہ یعنی نفس کا طبعی اقتضاء تو اس کا امّارہ ہونا ہے۔ وہ شہواتِ انسانی کے پورا کرنے میں منہمک رہتا ہے اور آرام طلبی کا بھی خواہاں ہوتا ہے لیکن جب اس کی تہذیب کر لی جاتی ہے تو وہ تائب ہو کر زہد اختیار کر لیتا ہے اور آرام طلبی کی بجائے جدّوجہد اس کی صفت بن جاتی ہے۔ نفس کے تزکیہ میں ہوائے نفس (خواہشات) کی مخالفت کو بڑا دخل ہے قرآن کریم میں فلاح کو تزکیۂ نفس سے وابستہ کیا گیا ہے " قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا " (الشمس : ۹)۔ اور مخالفتِ نفس کو باعثِ دخولِ جنّت کہا گیا ہے (النازعات : ۴۰، ۴۱) مولانا اشرف علی تھانوی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ :

" وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوّف کا۔ یہ ہے کہ جس اطاعت میں سستی ہو سستی کا مقابلہ کر کے اس اطاعت کو بجا لائے اور جس گناہ کا تقاضا ہو اس تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے۔ جس کو یہ بات حاصل ہو گئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔"

ہم نے ابھی اوپر بیان کیا کہ ان لطائفِ ثلاثہ (عقل، قلب اور نفس) کی تہذیب کے پروگرام کی ابتداء " ایمان باللہ " یا عقل کی تہذیب سے ہوتی ہے۔ لیکن اس " ایمان باللہ " کو " اتّصال باللہ " اور " تعلق مع اللہ " میں کیسے بدلا جائے اور قلب و نفس پر ایمان کا یہ رنگ کیسے چڑھایا جائے؟ اور کس طرح ان لطائفِ ثلاثہ میں ایک ہم آہنگی (HORMONY) پیدا کی جائے؟ ـــ ان چیزوں کے بارے میں اہلِ تصوّف نے تو بہت کچھ لکھا ہے ـــ تاہم ایک تو وہ اپنی مخصوص زبان اور اصطلاحات میں بات کرتے ہیں اور آج کل تو وہ بھی نہیں رہا اور تصوّف بعض مخصوص مفادات (VESTED INTERESTS) کے چند مخصوص نعروں یا ادّعاءات (دعووں) تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ ـــ دوسرے

یہ کہ صوفیہ نے بھی روحانی تزکیہ کے لئے جو قواعد و اصول بیان کئے ہیں ان کی اصل قرآن کریم اور اس کا بیان سنّت رسولؐ میں موجود ہے [اور جس نام نہاد تصوّف کی بنیاد اور اساس قرآن و سنّت نہیں وہ تصوّف نہیں گمراہی ہے] ـــــ اس لئے ہم بھی ان موضوعات کے بارے میں جب قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی بیسیوں آیات اسی روحانی نظام کے کسی نہ کسی پہلو (ASPECT) سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایمان باللہ (جس میں توحید، رسالت، آخرت سب شامل ہیں) تقویم باطن کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد عمل صالح کا میدان شروع ہوتا ہے جس کی پہلی منزل عبادت ہے۔ جس کے ذریعے عبودیت کا نور لطائفِ ثلاثہ میں سرایت کر کے اپنا اثر دکھاتا ہے ـــــ عبادات کے ساتھ ساتھ اسلام تہذیبِ اخلاق پر زور دیتا ہے ـــــ اور فضائل و رذائلِ اخلاق کا بیان کتاب و سنّت کا ایک اہم موضوع ہے جس پر مستقل تالیفات موجود ہیں ـــــ یہاں تک اپنے ظاہر کو اسلامی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا کام مکمل ہوتا ہے۔

لیکن اللہ کے ساتھ اپنے اس تعلق کو ترقی دینا اور اپنی روحانی اور باطنی کیفیات پر عبودیت کا گہرا رنگ چڑھانے کے لئے قرآن کریم نے جن امور پر زور دیا ہے اور جسے صوفیہ اور مفسرین نے اپنے اپنے رنگ میں بیان کیا ہے وہ حسب ذیل امور ہیں:-

۱- ذکر اللہ ۲- حبّ اللہ ۳- خشیۃ اللہ ۴- استغفار ۵- التوبۃ الی اللہ ۶- شکر ۷- صبر ۸- توکّل ۹- اخلاصِ نیت ۱۰- دعاء اور ۱۱- ان سب پر حاوی اور ان میں جاری و ساری ـــ اتّباعِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم ـــ اسلام کے روحانی نظام کی قرآنی بنیاد ان ہی موضوعات پر استوار ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک ایک موضوع پر قرآن و سنّت کی روشنی میں لکھا جا سکتا ہے اور لکھا گیا بھی ہے۔ لہٰذا ہم یہاں ان موضوعات یا عنوانات کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں اور آخر پر صرف اس طرف توجّہ دلا کر یعنی عقل، قلب اور نفس شریک ہوتے ہیں اور نماز کے ذریعے علی قدرِ استعداد ہر ایک کی تطہیر و تہذیب ہو رہی ہوتی ہے۔ اسی لئے نماز کو "معراج المؤمنین" کہا گیا ہے۔ ساری روحانیت کی ابتداء بھی یہی ہے اور انتہا بھی یہی ہے ـــــ اور مندرجہ بالا جملہ گیارہ امور بھی اجمالاً سب کے سب نماز میں شامل ہیں۔

★★